# دستور ہند

## اور

# یونیفارم سول کوڈ

کیا یونیفارم سول کوڈ کی تدوین دستوری ذمہ داری ہے؟

کیا ایسے کوڈ کا نفاذ ملک کے مفاد میں ہے......؟

از

**محمد عبدالرحیم قریشی**

اسسٹنٹ جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

شائع کردہ

مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

76A/1، مین بازار، اوکھلا گاؤں، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵

Ph: +91-11-26322991, Telefax: +91-11-26314784

E-mail: aimplboard@gmail.com / www.aimplboard.in

(©جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ)

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | دستور ہند اور یونیفارم سول کوڈ |
| مصنف | : | محمد عبدالرحیم قریشی (اسسٹنٹ جنرل سکریٹری بورڈ) |
| اشاعت چہارم | : | مارچ ۲۰۱۳ء |
| تعداد اشاعت | : | ایک ہزار |
| کمپوزنگ | : | مرکزی دفتر بورڈ، نئی دہلی (فیضان احمد ندوی) |
| پروف ریڈنگ | : | وقارالدین لطیفی |
| قیمت | : | ۱۵؍روپے |

ناشر

مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ-نئی دہلی

# فہرست


دستوراور یونیفارم سول کوڈ ...... ۴

دستور کے رہنما اصول: ...... ۴

یونیفارم سول کوڈ کی ضرورت کیوں ہے؟ ...... ۸

پہلی ضرب: ...... ۹

آرٹیکل ۳۷۱ (اے) ...... ۱۰

میزو۔ناگاؤں کے نقش قدم پر ...... ۱۱

کیا یکسانیت کا حصول ممکن ہے؟ ...... ۱۲

بنیادی حقوق اور یونیفارم سول کوڈ ...... ۱۳

کیا کوڈ کی تدوین آئینی ضرورت ہے؟ ...... ۱۶

مسلم پرسنل لا ...... ۱۷

ہندوستانی مسلم سماج ...... ۲۲

یونیفارم سول کوڈ سے کیا حاصل ہوگا؟ ...... ۲۳




# دستوراور یونیفارم سول کوڈ

یہ بڑی بدبختی کی بات ہے کہ ایسے وقت جب کہ دہشت گردی، مرکز گریز تحریکات اور فسطائیت سے ملک کے سیاسی نظام، اس کے جمہوری ڈھانچہ، سیکولر کردار اور تہذیبی رنگارنگی کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے، ایک انتہائی حساس اور اختلاف ابھارنے والے مسئلہ کو جو یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ سے متعلق ہے دوبارہ چھیڑا گیا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ جس پر اتفاق رائے ناممکن ہے۔ موجودہ صورت حال میں اختلافات کو بڑھانے والے اور انتشار پیدا کرنے والے مسائل کو چھیڑنا ملک کی خدمت نہیں ہے۔

## دستور کے رہنما اصول:

اس میں شک نہیں کہ دستور کے آرٹیکل (۴۴) میں یہ کہا گیا ہے، کہ مملکت ہندوستان کے سارے علاقوں میں تمام شہریوں کے لئے یونیفارم سول کوڈ ترتیب دینے کی کوشش کرے گی۔ دستور کے رہنما اصولوں کے تعلق سے جو اس چوتھے حصے میں درج ہیں یہ بات عوام کے سامنے آنی چاہئے اور اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ بہت سے رہنما اصولوں کی نوعیت ایسے نشانوں کی ہے جن کا حصول مشکل ہی نہیں بلکہ بعض صورتوں میں ناممکن ہے۔ اسی لئے دستور نے آرٹیکل (۳۷) کے ذریعہ یہ واضح کردیا کہ اس حصے میں درج رہنما اصول عدالتوں کے ذریعے قابل نفاذ نہیں ہیں۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص عدالت سے یہ حکم یا ہدایت حاصل نہیں کرسکتا کہ فلاں اصول کو نافذ کیا جائے یا اس کی تعمیل کی جائے۔ اسی طرح اگر کوئی رہنما اصول نافذ نہیں ہے یا اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے تو یہ بات نہ دستور کی خلاف ورزی متصور ہوگی اور نہ اس کے لئے حکومت کو مورد الزام قرار دیا جائے گا۔

ان رہنما اصولوں میں سے بعض کی نوعیت ایسے سنہرے خوابوں کی ہے جو کبھی زندگی کی حقیقت نہیں بنتے۔ آمدنیوں میں فرق و تفاوت کو اتنا گھٹانا کہ مساوات یا برابری کی شکل پیدا ہو جائے ایک سنہری خواب نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا ایک محنت کش کبھی رتبہ اور حیثیت میں وزیر اعظم، چیف منسٹرس، صنعت کار یا کم سے کم اس افسر یا اپنے آجر کے برابر ہو سکتا ہے جس کے تحت وہ کام کرتا ہے؟ کیا دور دراز کے قصبہ یا دیہات میں رہنے والا ایک دیہاتی ان سہولتوں کا خواب بھی دیکھ سکتا ہے جو سہولتیں قومی دارالحکومت دلی یا مالی صدر مقام بمبئی یا کلکتہ یا کسی دوسرے بڑے شہر میں رہنے والے کو حاصل ہیں؟ یہ خواب دیکھنے میں بہت سہانا اور خوش کن ہے کہ "نہ صرف افراد کے درمیان بلکہ مختلف علاقوں میں رہنے والوں یا مختلف پیشوں میں کام کرنے والے گروہوں کے رتبوں، سہولتوں اور مواقع کے درمیان نابرابری کو ختم کر دیا جائے۔" یہی بات آرٹیکل ۳۸ (۲) میں کہی گئی ہے، کیا یہ سنہرا سپنا نہیں ہے؟ بعض رہنما اصول ایسے ہیں کہ جہاں تک مستقبل میں نظر جاتی ہے بڑی طویل مدت تک بھی ان کا حصول ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ آنے والی صدی کے اختتام تک بھی ملک کے ہر شہری کو روزگار کے موزوں ذرائع فراہم کر دئے جائیں گے۔ (آرٹیکل (۳۹) الف) رہنما اصولوں میں یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ نظام قانون کو اس طرح پروان چڑھایا جائے کہ ہر شہری کو انصاف حاصل کرنے کے مساوی مواقع ملیں (آرٹیکل (۳۹) الف)۔ کتنی دہائیوں میں ایسا نظام قائم ہو سکے گا؟ کیا آپ اس کا کوئی اندازہ کر سکتے ہیں؟ اب تو عدالت سے انصاف حاصل کرنا دن بدن مہنگے سے مہنگا ہوتا جا رہا ہے۔ انصاف کے لئے سپریم کورٹ جانے اور وہاں کے مشہور وکیل کو اپنی پیروی کے لئے مقرر کرنے کا حوصلہ صرف ایک کروڑ پتی ہی کر سکتا ہے، ایسا نظام کب بنے گا جب عدالتوں سے انصاف حاصل کرنے کے مواقع غریب و امیر، شہری و دیہاتی، لیڈر و عوام سب کو مساوی طور پر حاصل ہوں؟ یہ صرف خواب ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

رہنما اصولوں میں سے چند ایسے ہیں جن کو نافذ کیا جا سکتا ہے اور ان کا حصول بھی ممکن



ہے لیکن ان کے لئے جرأت مندتدبر کی ضرورت ہے۔ چونکہ ہماری سیاست میں جرأت مندتدبر کا فقدان ہے اس لئے یہ اصول صرف کاغذ کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ آرٹیکل ۳۹ (سی) میں کہا گیا ہے کہ مملکت، دولت کے ارتکاز اور اسی طرح پیداوار کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے خلاف اقدامات کرے گی۔ آج تک اس سمت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا کیوں کہ ارب پتی سرمایہ داروں اور کھرب پتی خاندانوں کے خلاف قدم اٹھانے کے لئے بڑی جرأت اور حوصلہ چاہئے۔ آرٹیکل (۴۷) میں نشہ آور چیزوں پر مکمل امتناع کا اصول درج ہے، گاندھی جی کی بھی بڑی آرزو تھی کہ مکمل نشہ بندی ملک میں رواج پائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا آج تک کسی حکومت نے اس سمت میں کوئی قدم اٹھایا؟

رہنما اصولوں میں چند ایسے ہیں جن کے نفاذ کے لئے بھاری اخراجات ہوں گے، ان اخراجات کی پابجائی ٹیکس میں اضافہ کئے بغیر بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ہمارے ارباب حکومت وزیر اعظم، چیف منسٹرس، وزراء اور دیگر حکام شاہانہ اخراجات کو کم کر دیں، غیر ضروری بیرونی دوروں کا سلسلہ روک دیا جائے اور غیر ترقیاتی اور غیر ویلفیئر اخراجات ہوتے ہیں ان کو روک دیا جائے تو یہ امور انجام دئے جا سکتے ہیں۔ مگر ارباب حکومت، حکام کے شاہانہ اخراجات میں اور کانفرنسوں وغیرہ کے تماشوں میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، کون ان کو روکے گا! یہ اصول بہبودی کے اقدامات (ویلفیئر اقدامات) سے متعلق ہیں۔ آرٹیکل ۳۹ (ای) میں ایسے دن کا خواب دیکھا گیا ہے کہ جس دن پیٹ کی آگ بجھانے اور دو وقت کی روٹی کمانے کے لئے کسی کو ایسے کام اور پیشے کو اختیار کرنا نہ پڑے گا جو اس کی عمر اور اس کی طاقت سے مناسبت نہ رکھتا ہو۔ آج ہر شہر میں روزانہ کوڑا کرکٹ، کیچڑے اور گندگی میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو کئی کئی گھنٹے کاغذ اور دوسری چیزیں چنتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے تاکہ وہ اپنے لئے اور اپنے اس خاندان کے لئے ایک وقت کی روٹی کا سامان کر سکیں جو اتنا مفلس ہے کہ نہ انہیں کھلا سکتا ہے نہ کپڑے پہنا سکتا ہے اور نہ اسکول بھیج سکتا ہے۔ ہر شہر میں بوڑھے بلکہ معذور اور بیمار بھی رکشہ کھینچتے ہوئے اور اپنی پیٹھوں پر اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھاتے

ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ چندنوالے پیٹ کی آگ کو بجھانے کے لئے مل سکیں۔ آرٹیکل (۴۱) میں بے روزگاری، بوڑھاپے، بیماری اور معذوری کی صورت میں جو مصیبت آن پڑتی ہے اس کو عوامی مدد کے ذریعہ کم کرنا مملکت کی ذمہ داری بتایا گیا ہے بلکہ اس عوامی امداد کو ان لاچاروں کا حق قرار دیا گیا ہے۔ اس اہم رہنما اصول کو ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ آرٹیکل (۴۵) کے ذریعہ حکومت سے کہا گیا کہ وہ ۱۴ سال کی عمر ہونے تک تمام بچوں کے لئے لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام کرے۔ بچوں کے لئے لازمی مفت تعلیم کی کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ ہر شخص اور ہر شہری کرسکتا ہے لیکن اتنے اہم رہنما اصول پر کسی حکومت نے عملاً کچھ نہیں کیا۔ اس عمر تک کے بچوں کے لئے آٹھویں کلاس تک کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کیلئے قانون سازی ضرور کی گئی۔ مگر یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جبکہ دیہات۔ دیہات، آبادیوں میں ہر دو، تین کیلومیٹر میں اسکول ہو، اس کے لئے تو کچھ نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان بچوں بوڑھے اپاہج، باپ، ماں، دادی، نانی کی بھوک مٹانے کا انتظام کرنا ہوگا جو ہوٹلوں میں کام کرے، برتن صاف کرکے یا دوسرے طریقے سے اپنے اور اپنے بوڑھے یا بوڑھی سرپرست کے دو وقت کی روٹی کا انتظام کرلیتے ہیں۔ قانون صرف عوام کو دھوکہ دینے کے لئے بنایا گیا ہے۔

لوک سبھا کے اندر اور باہر صرف ایک ہی رہنما اصول ''یونیفارم سول کوڈ'' کے لئے آواز اٹھتی ہے، شور اور پکار ہوتی ہے، سپریم کورٹ کے جسٹس کلدیپ سنگھ نے اپنے ایک فیصلے میں مرکزی حکومت کو ایسے کوڈ کے معاملے میں پس وپیش کرنے کا قصوروار قرار دیا اس فیصلے کے بعد یونیفارم سول کوڈ کا مسئلہ دوبارہ منظر عام پر آیا۔ بعض سیاسی جماعتوں نے یہ اعلان کردیا ہے کہ وہ اس کو الیکشن کا ایشو بنائیں گی۔ اس مسئلہ کو مسلمانوں پر ہٹ دھرم، ضدی اور غیر معقول ہونے کا الزام لگانے کے لئے اور حکومت پر مسلمانوں کی دلجوئی اور خوشامد کا طعن دھرنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔ لیکن کہیں کوئی یہ مطالبہ نہیں کرتا اور یہ آواز وتحریک نہیں اٹھتی کہ بچوں کے لئے مفت لازمی تعلیم کا واقعی انتظام کیا جائے۔ بے روزگاروں، بوڑھوں، بیماروں اور بچوں کو سہارا دیا جائے



جو سخت محنت ومشقت پر مجبور ہوگئے۔ کسی سیاسی جماعت نے ان مسائل کو اپنے الیکشن ایجنڈے میں شامل کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ تمام رہنما اصولوں میں سے صرف ایک یونیفارم سول کوڈ کا رہنما اصول ہی نظروں میں ہے اور باقی سب نظروں سے اوجھل۔

## یونیفارم سول کوڈ کی ضرورت کیوں ہے؟

تصور یہ ہے کہ ایک مشترکہ سول کوڈ سے اتحاد بڑھے گا۔ پرسنل لا کی یکسانیت یکتائی کے احساس کو بڑھائے گی اور مختلف گروہوں کے درمیان امن وہم آہنگی کو پروان چڑھائے گی، جو لوگ یوروپی ممالک میں قوم پرستی کی تحریکات سے متاثر تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس طرح کی یکسانیت قومیت کے تصور کی امتیازی خصوصیت ہے اور یہ کہ اس اشتراک ویکسانیت سے قوم پرستی کا جذبہ طاقت ور ہوگا۔ لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو محسوس نہ کرسکے کہ ہندوستان یوروپی ملکوں کی طرح چھوٹا ملک نہیں ہے اور یوروپی اقوام کی طرح ایک نسل، ایک تہذیب یا ایک زبان کا ملک بھی نہیں ہے۔ یوروپی ممالک کے برخلاف، ذیلی براعظم جیسی وسعت رکھنے والا یہ ملک ہندوستان کئی اور مختلف تہذیبوں، مذہبوں، زبانوں اور نسلوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اگر ہم یورپ کے تناظر میں دیکھیں تو ہندوستان کئی قومیتوں پر مشتمل ایک قوم ہے۔ یہ ایک ندی یا دریا نہیں بلکہ ایک سمندر ہے۔

مشترکہ اور یکساں سول کوڈ کی بات کہنے والوں میں وہ ماڈرن ذہن وفکر رکھنے والے بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ تمام قدیم عادتوں، رسوم اور رواجات کو ترک کرنا ہندوستان کو ایک ماڈرن ملک بنانے کے لئے ضروری ہے۔ ان لوگوں کا یہ تصور ہے کہ مذہب کے اثر کو بالکل ختم یا کم سے کم کئے بغیر ماڈرن بننا ممکن نہیں ہے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ شادی، وراثت، خاندانی حقوق اور ذمہ داریوں کے معاملات سے مذہب کو بالکلیہ بے دخل کردیا جائے۔ یہ معاملات سیکولر قوانین کی بنیاد پر طے پائیں۔ یہ ماڈرن ذہن رکھنے والے افسوس کہ اس حقیقت کو نہ دیکھ سکے کہ مذہب ہندوستان کے رگ وریشے میں پیوست ہے، ان کو کرنا یہ چاہئے تھا کہ ملک کو ڈیولپمنٹ، ترقی، سائنسی جستجو وتحقیق کے

راستے پر گامزن کرنے کے لئے مغرب کی نقل کرنے کے بجائے ہندوستانی زندگی کی حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے راستے اور ذرائع تلاش کرتے۔ دستور کی تدوین کے وقت ان دو رجحانات نے یونیفارم سول کوڈ کی دفعہ شامل کرنے پر زور لگایا۔ دستور ساز اسمبلی کے کئی مسلم ارکان نے اس کی مخالفت کی۔ ڈاکٹر بی آر امبیڈکر خود یونیفارم سول کوڈ کے پرجوش حامی تھے لیکن مسلم ارکان کے اندیشوں کو دور کرنے بلکہ ان کو تسلی دینے کے لئے انہوں نے یہ کہا کہ ''کوئی حکومت ان اختیارات کا استعمال اس انداز میں نہیں کرے گی کہ جس سے مسلم فرقے میں بغاوت کے لئے اشتعال پیدا ہو۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا کام صرف پاگل حکومت ہی کرے گی''۔ یونیفارم سول کوڈ کی دفعہ شامل کرنے کی کوششوں کے پیچھے یہی خواہش اور آرزو تھی کہ اس کے ذریعہ ہندوستان کی مختلف عوام، طبقوں اور فرقوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی پیدا ہو، یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا تھا کہ قوانین کی یکسانیت خاص طور پر شادی، طلاق، وراثت اور دوسرے خاندانی معاملات کے قوانین کی یکسانیت عوام کے درمیان اتحاد کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرے گی، اور مختلف مذہبی، تہذیبی اور نسلی گروہوں کے درمیان امن و ہم آہنگی کے لئے اساس بنے گی۔ یونیفارم سول کوڈ کے حامیوں کی نیت قابل تعریف سہی لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان لوگوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور تاریخ کی بعض تلخ حقیقتوں کو نظر انداز کر دیا۔ پرسنل لا، لباس، وضع قطع اور روایات کی یکسانیت بھی یورپی ممالک کو دو انتہائی خون آشام عالمی جنگوں سے نہ روک سکی۔ انہوں نے اس حقیقت سے بھی آنکھیں بند کر لیں کہ ہر مذہبی، تہذیبی اور نسلی گروہ میں اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھنے کی زبردست خواہش ہوتی ہے۔ اپنی انفرادی شناخت کے تحفظ اور اس کو منوانے کی تحریکات آج ایک عالمی مسئلہ ہیں۔

## پہلی ضرب:

اس مفروضے پر کہ پرسنل لا کی یکسانیت اتحاد اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے، پہلی ضرب ۱۹۶۰ء میں لگی جب کہ ناگاؤں نے دیگر شرائط کے ساتھ اس بات کا مطالبہ کیا کہ ان کے مذہبی اور



سماجی طور طریقوں اور رواجی قانون کے مطابق انصاف رسانی کے نظام کے تحفظ کی مضبوط ضمانت دی جائے، اس بات کو انہوں نے ہتھیار ڈالنے اور ہندوستان اور ہندوستانی فوجوں کے خلاف مخالفانہ کارروائیوں کو ختم کرنے کے لئے شرط اولین قرار دیا۔ ناگاؤں کو ہندوستانی قومیت میں داخل کرنے اور ملک کی علاقائی سالمیت کو محفوظ رکھنے کی خاطر حکومت ہند نے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا اور یکسانیت کا مفروضہ اس طرح جھوٹ اور غلط ثابت ہوا۔ اس کے برخلاف تہذیب و تمدن کی رنگا رنگی اور اختلاف کو تسلیم کرنے اور رواجی قوانین کو جن کی بنیاد مذہب اور رواج پر ہے تحفظ دینے سے ناگاؤں اور ملک کے دوسرے شہریوں کے درمیان قومیت کے رشتے استوار ہوئے اور شمالی مشرقی علاقوں میں امن بحال ہوا۔ ناگاؤں سے کئے گئے اس معاہدے کو روبہ عمل لانے کے لئے ۱۹۶۲ء میں دستور میں ترمیم کی گئی اور بڑے مضبوط الفاظ میں ناگاؤں کو ان کی انفرادیت کا تحفظ فراہم کیا گیا۔

## آرٹیکل ۳۷۱ (اے)

ناگاؤں سے معاہدے کے بموجب دستور میں ترمیم کرتے ہوئے آرٹیکل ۳۷۱ (اے) داخل کیا گیا جس میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) ناگاؤں کے مذہبی اور سماجی رسوم

(۲) ناگا رواجی قانون اور ضابطے

(۳) ناگا رواجی قانون کے مطابق سول اور فوجداری مقدمات کی سماعت اور فیصلوں کے نظام کے تعلق سے پارلیمنٹ کے کسی قانون کا اطلاق ناگالینڈ کی ریاست پر نہیں ہوگا۔ اس مضبوط ضمانت کے بعد یہ الفاظ ضرور لکھے گئے کہ:

''تا آں کہ ناگالینڈ کی لجسلیٹیو (Legislative) اسمبلی ایک ریزولیشن کے ذریعہ اس کا فیصلہ کرے۔''

یہ جملہ بے معنی ہے کیوں کہ ناگا اسمبلی میں ناگاؤں کی اکثریت کبھی بھی اپنے رواجی قوانین وضوابط کے خلاف بنائے گئے پارلیمنٹ کے کسی قانون کو قبول نہیں کرے گی۔ ناگاؤں کے ساتھ یہ تجربہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی تھا کہ آرٹیکل (۴۴) کسی اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

## میزو۔ناگاؤں کے نقش قدم پر:

شمالی مشرقی علاقے میں ناگاؤں کے بعد میزوؤں نے ہندوستان کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے اور آزاد میزو مملکت کے قیام کے لئے مسلح جدوجہد شروع کی، یہ تصادم سالہا سال چلتا رہا۔ حکومت ہند نے میزوؤں کی بغاوت کو فوجی طاقت کے ذریعہ کچلنے کی کوشش کی۔ کئی ناکامیوں کے بعد میزوؤں کے ساتھ بات چیت شروع ہوئی۔ میزو ہتھیار ڈالنے، مسلح بغاوت ختم کرنے، ہندوستان کا حصہ بننے، ہندوستانی قومیت اختیار کرنے اور اس ملک کی شہریت قبول کرنے پر چند شرائط کے تحت آمادہ ہوگئے۔ پہلی شرط یہ تھی کہ ان کی علیحدہ شناخت کو تسلیم کیا جائے، اور اس کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔ سماجی اور رواجی قوانین اور ان قوانین کے تحت نزاعات کے تصفیے کے رواجی طریقے کو تسلیم کیا جائے اور یہ طمانیت مضبوط الفاظ میں دستور میں فراہم کی جائے۔ کئی دور میں بات چیت کے بعد حکومت ہند نے اس شرط کو قبول کرلیا اور ناگاؤں کی طرح میزوؤں کو بھی تحفظ کی ضمانت دینے پر رضامندی ظاہر کی، چنانچہ ایک معاہدہ ۳۰/جون ۱۹۸۶ کو طے پایا اور اسی معاہدے کے مطابق دستور میں ترمیم کرکے آرٹیکل ۳۷۱ (جی) کا اضافہ کیا گیا۔ اس آرٹیکل کے ذریعے میزوؤں کو یہ ضمانت دی گئی کہ پارلیمنٹ کے کسی قانون کا اطلاق اور نفاذ، میزوؤں کے مذہبی وسماجی رسوم، رواجی قوانین وضوابط اور ان کے مطابق نزاعات کے تصفیے کے نظم پر نہیں ہوگا۔ اسی ضمانت نے میزوؤں کو ہندوستانی قوم و ملک کا حصہ بننے پر آمادہ کیا اور ان کی انفرادیت اور علیحدہ شناخت کو تسلیم کرنے سے ملک کی علاقائی سالمیت کا استحکام ہوا۔



جب کہ دستور نے یہ اعلان کیا ہے کہ میزوؤں اور ناگاؤں کے رواجی قوانین پر پارلیمنٹ کے کسی قانون کا اطلاق نہیں ہوگا، حکومت کس طرح ایسا سول کوڈ بنا سکتی ہے جو یکساں طور پر سارے ملک کے تمام شہریوں پر نافذ ہو۔ خود دستور نے ایسے سول کوڈ کو ناممکن العمل اور ناممکن الحصول بنادیا ہے۔ دستور میں فراہم کی گئی اتنی مضبوط ضمانت کے خلاف کسی قدم کو اٹھانے کا نتیجہ کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

## کیا یکسانیت کا حصول ممکن ہے؟

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دستور کے ساتویں جدول (شیڈول) کی مشترکہ فہرست میں شادی وطلاق، شیرخوار ونابالغ، وصیت ووراثت اور تقسیم جائیداد کے موضوعات شامل کئے گئے ہیں۔ اس فہرست کے موضوعات پر مرکز اور ریاستوں دونوں کو قانون سازی کا اختیار حاصل ہے۔ پارلیمنٹ بھی قانون بنا سکتی ہے اور اس قانون میں ریاستی اسمبلیاں ترمیم، تبدیلی اور اضافہ کرسکتی ہیں بلکہ علیحدہ قانون بھی بنا سکتی ہیں۔ چنانچہ ہندو لا میں کئی ریاستی اسمبلیوں نے مختلف ترمیمات اور اضافے کئے ہیں۔

ہندو سماج کی یکجائی کو برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مقامی رسوم اور رواجات کے لئے گنجائش فراہم کی جائے۔ ہندو لاء میں ریاستی اسمبلیوں نے ایسی ترمیمات کی ہیں کہ ان قوانین کی یکسانیت سطحی اور برائے نام ہوکر رہ گئی ہے۔ اس صورت حال پر جنوبی ہند کے ایک ہائی کورٹ نے یہ تبصرہ کیا کہ:

''ہندوؤں کے طلاق کے قانون میں کوئی یکسانیت نہیں پائی جاتی۔''

اور اس تبصرے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ:

''یہ اختلافات سابقہ تاریخ اور تہذیبوں کے فرق وغیرہ کا نتیجہ ہیں۔''

(اے۔آئی۔آر ۱۹۶۳ء۔میسور۔صفحہ ۲۴۵)

## بنیادی حقوق اور یونیفارم سول کوڈ:

مسلمان اور دوسرے مذہبی اور تہذیبی گروہ بجا طور پر یہ ادعا کر سکتے ہیں کہ ان کے پرسنل لا، ان کے مذہب اور تہذیب وتمدن کا اٹوٹ حصہ ہیں، دستور کے آرٹیکل (۲۵) میں آزادئ مذہب کے ضمن میں عقیدہ رکھنے کی آزادی، اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی اور اپنے مذہب کے پرچار کی آزادی کو بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔ آرٹیکل ۲۶ (بی) میں ہر مذہبی گروہ اور اس کے کسی فرقہ کو مذہب کے معاملہ میں اپنے امور کے انتظام کا حق دیا گیا ہے۔ سپریم کورٹ نے آرٹیکل (۲۵) میں دی گئی آزادئ مذہب کے کئی کیسیس میں وضاحت کی ہے اور یہ فیصلے دئے ہیں کہ آزادی کی اس ضمانت میں رسومات، تقریبات وغیرہ شامل ہیں۔ سامیار شرورمٹھ کیس میں سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا کہ:

''یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مذہب، عقیدے یا نظریے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ مذہب نہ صرف اخلاقی قواعد وضوابط مقرر کرسکتا ہے تا کہ اس کے پیرو اس کو قبول کریں، مذہب، رسوم، تقریبات اور عبادات کے طریقے بھی مقرر کرسکتا ہے جن کو مذہب کا اٹوٹ حصہ سمجھا جاتا ہے، اور یہ شکلیں اور طریقے کھانے پینے اور پہننے کے معاملات کے لئے بھی ہوسکتے ہیں۔''

(اے۔آئی۔آر۱۹۵۴ء سپریم کورٹ ۲۸۲)

سپریم کورٹ نے یہ اصول بھی متعین کیا ہے کہ اگر ایک مذہبی فرقہ کسی رسم یا طریقے کو اپنے مذہب کا اٹوٹ حصہ سمجھتا ہے اور یہ بات عدالت کے سامنے ثابت ہوتی ہے تو عدالت اس عقیدے کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ نہیں کرسکتی اور کوئی جج اس عقیدے کو جدید تصورات یا اپنے نظریات کی کسوٹی پر کس نہیں سکتا۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ ہے کہ:

''ایک مذہبی رسم، مذہب کا اٹوٹ حصہ ہے یا نہیں اس سوال کا تصفیہ کرنے



کے لئے ہمیشہ کسوٹی یہ ہوگی کہ کیا اس مذہب کو ماننے والا فرقہ اس کو اپنے مذہب کا حصہ سمجھتا ہے یا نہیں۔''

(اے۔آئی۔آر۱۹۶۳ء سپریم کورٹ ۱۶۳۸)

کئی سالوں کے بعد جب مذہبی طور طریقوں اور رواجات کا مسئلہ دوبارہ سپریم کورٹ میں اٹھایا گیا تو اس عدالت نے یہی فیصلہ دیا کہ:

''ان آرٹیکلس (۲۵ اور ۲۶) کا تحفظ صرف نظریہ اور عقیدے کے معاملات تک محدود نہیں ہے۔ اس کی وسعت ان اعمال تک بھی ہے جو مذہب کی متابعت میں کئے جاتے ہیں۔ اس لئے اس میں رسوم و رواجات، تقریبات اور عبادات کے طور طریقوں کی ضمانت شامل ہے جو مذہبی عمل کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ کیا چیز مذہبی عمل کا ایک لازمی حصہ ہے اس سوال کا تصفیہ عدالت کو اس خاص مذہب کے نظریے وعقیدے کے حوالے سے کرنا چاہئے جس میں وہ اعمال بھی شامل ہیں جن کو یہ فرقہ اپنے مذہب کا جزء سمجھتا ہے۔''

(۱۹۷۲ء (۳) سپریم کورٹ رپورٹس ۸۱۵)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مسلمان اپنے پرسنل لا کو اپنے مذہب کا اٹوٹ حصہ سمجھتے ہیں۔ مسلمان، دیگر اقلیتیں اور تہذیبی گروہ اپنے پرسنل لاز کے تحفظ کا ادعا آرٹیکل (۲۹) کے تحت بھی کرسکتے ہیں۔ آرٹیکل ۲۹ (۱) ہر لسانی اور تہذیبی اقلیت کو اپنی تہذیب کو برقرار رکھنے کا حق دیتا ہے اور اس حق کا تحفظ فراہم کرتا ہے یہ حق اور تحفظ ان لسانی گروہوں تک کو دیا گیا ہے جو اپنا ایک علیحدہ رسم الخط رکھتے ہیں۔

مسلمان مذہب اسلام سے وابستگی کی بنیاد پر مسلمان بنتے ہیں اور ان کی ایک مخصوص تہذیب ہے۔ مسلمانوں کے تہذیب وتمدن میں وہ تمام باتیں داخل ہیں جو نسلہا نسل سے مذہب

کے واسطے وراثت میں آئی ہیں اوران میں نکاح، طلاق، خاندان اورافرادخاندان کےحقوق اور ترکہ ووراثت کے معاملات شامل ہیں۔ دوسروں کے لئے اس بات کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ کس طرح ان معاملات کے اصول اوراحکامات، مذہب وتہذیب وتمدن کا جز ہیں۔ مسٹرجسٹس وی۔آرکرشنا ایرّ (ریٹائرڈ) نے خود اس دقت اورمشکل کو محسوس کیا تبھی توانہوں نے یہ ریمارک کیا کہ کسی تہذیب وتمدن کی روح اس کا ضابطہ بند قانون ہے جواس فرقے کے تمدنی اقدار کا قابل نفاذ حصہ ہے، جس کی اہمیت کو ایک اجنبی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا (۱۹۷۰ء کیرالہ لاٹائمس ۴۷۷)۔

شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے کئی ہم وطن یہ سمجھ نہیں پاتے کہ مسلمان کیوں مسلم پرسنل لا کی برقراری پراتنا شدید اصرار کرتے ہیں۔

سرلا مڈگل کیس میں جسٹس کلدیپ سنگھ نے غیرموزوں اورانتہائی نامناسب ریمارک دیا کہ:

''ایک مہذب معاشرے میں مذہب اور پرسنل لاز کے درمیان کوئی لازمی تعلق نہیں ہوتا۔''

اس ریمارک کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ مذہب ایک تہذیب وتمدن کا اہم جزء ہوتا ہے اور شادی، ترکہ ومیراث وغیرہ سے متعلق ضابطے اس مذہب اورتہذیب وتمدن کا ایک اہم حصہ ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسی کیس میں ساتھی جج مسٹرجسٹس آر۔این۔ سہائے نے اپنے علیحدہ فیصلے میں مختلف نقطۂ نظر اختیار کیا اورلکھا کہ مقدس کتابوں مثلاً رامائن یا قرآن یا بائبل پڑھنا اورورد کرنا ایسا ہی مذہب کا حصہ ہے جیسا کہ کسی ہندو کی طرف سے دیوتا کو کھانا پیش کرنا، بت کو نہلانا اورکپڑے پہنانا اورمندر، مسجد، چرچ اورگرودوارہ میں جانا۔شادی (نکاح)، میراث، طلاق، تبدیلیٔ مذہب یہ اپنی نوعیت وہیئت کے اعتبار سے ویسے ہی مذہبی امور ہیں جیسے کہ کسی مذہب کا عقیدہ ایک مذہبی امر ہے۔(۱۹۹۵ء (۳) اسکیل ۲۸۶)



# کیا کوڈ کی تدوین آئینی ضرورت ہے؟

ہندوستان کے دستور میں شہریوں کے بنیادی حقوق تیسرے حصے میں درج کئے گئے ہیں۔ان حقوق کو اتنی اہمیت اورقوت حاصل ہے کہ مملکت کو ایسے کسی قانون کے بنانے سے منع کر دیا گیا ہے جس سے یہ حقوق چھن جائیں یا ان کو کم یا محدود کردیا جائے اوراگرکوئی ایسا قانون بنایا بھی جائے تو اس قانون کا وہ جزء جو بنیادی حقوق کو متاثر کرتا ہے کالعدم اورقانونی طور پر بے اثر قرار پاتا ہے (آرٹیکل-۱۳)۔یہ بات واضح ہے کہ رہنما اصول عدالتوں کے ذریعہ قابل نفاذ نہیں ہیں۔اوران کی تعمیل بھی ضروری نہیں ہے جب کہ بنیادی حقوق کا یہ مقام ہے کہ اگرکسی کا یہ حق ختم یا کم کیا جاتا ہے تو عدالت کے ذریعہ وہ سپریم کورٹ یا کسی ہائی کورٹ کے ذریعہ اپنے حقوق کا نفاذ اورتعمیل کرواسکتا ہے (آرٹیکل ۳۲ اورآرٹیکل ۲۲۶) ایسی صورت میں یہ بات ظاہر ہے کہ رہنما اصول انتہائی کم تر موقف رکھتے ہیں اورکسی رہنما اصول اورکسی بنیادی حق کے درمیان تصادم کی صورت میں بالادستی بنیادی حق کو حاصل ہوگی، آرٹیکلس ۲۵، ۲۶، اور۲۹ بنیادی حقوق سے متعلق ہیں اور یہ پرسنل لا کے احکامات کی پیروی اوران کے مطابق زندگی گزارنے کے حق کو تسلیم کرتے ہیں یہ بنیادی حقوق تمام مذہبی فرقوں اورتہذیبی وتمدنی گروہوں کی علیحدہ شناخت اورانفرادیت کو تسلیم کرتے ہیں اوران کے تحفظ کی ضمانت دیتے ہیں۔مشہور کیرالہ قومی ترانہ کیس میں سپریم کورٹ نے کہا کہ:

''آرٹیکل (۲۵) دستور میں ایک اعتماد کی دفعہ ہے، جس میں اس اصول کو تسلیم کیا گیا ہے کہ ایک صحیح جمہوریت کی حقیقی جانچ اس کی یہ صلاحیت ہے کہ اس ملک کے دستور کے تحت ایک چھوٹی معمولی اقلیت بھی اپنی شناخت پاسکتی ہے آرٹیکل (۲۵) کی تاویل وتعبیر کے وقت اس بات کو ذہن نشین

رہنا چاہئے (اے۔آئی۔آر۔۱۹۸۷ سپریم کورٹ ۷۴۸)۔ پرسنل لا کے نفاذ کے موضوع پر سپریم کورٹ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ عدالتوں کو یہ چاہئے کہ مستند اور مسلمہ سرچشموں سے ماخوذ پرسنل لا کو نافذ کریں۔''

(اے۔آئی۔آر ۱۹۸۰ء سپریم کورٹ ۷۰۷)

دستور اور دستوری نکات کی سپریم کورٹ کے ذریعے تعبیر اور تشریح کی بنیاد پر پوری قوت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ دستور نے پرسنل لاز کی رنگارنگی اور عدم یکسانیت کو تسلیم کیا ہے، جائز قرار دیا ہے اور وہ ان کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یونیفارم سول کوڈ کی ترتیب اور نفاذ قطعاً دستوری طور پر لازم اور ضروری نہیں ہے۔ ہمارا دستور ایک ایسے وفاقی سیاسی ڈھانچے اور رنگارنگی معاشرے کا تصور دیتا ہے جہاں مذہبی فرقوں اور تہذیبی وحدتوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور اپنے تہذیب وتمدن کو برقرار رکھنے اور اپنے پرسنل لاز پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔

## مسلم پرسنل لا

نکاح، تفریق، نفقہ، مہر، ولایت، وصیت، وراثت، تبنیت وغیرہ کے معاملات میں شریعت کے احکامات مسلم پرسنل لا کہلاتے ہیں اور یہ دین اسلام کا اٹوٹ حصہ ہیں کیونکہ ان احکامات کی بنیاد قرآن کریم پر ہے جس کو مسلمان اللہ تعالی کا کلام مانتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی سنت بھی ان احکامات کی ایک اہم اساس ہے۔ فقہ اسلامی کے مختلف مکاتب کے درمیان اختلاف فروعی معاملات میں ہیں بنیادی اصولوں میں تقریباً سب متفق ہیں۔

(۱) تعدد ازدواج

(۲) شوہر کو طلاق دینے کا ایک طرفہ غیر مشروط اختیار

(۳) بیوی کی یہ مجبوری کہ شوہر کی مرضی کے بغیر چھٹکارا نہیں پاسکتی۔ خلع یا طلاق نہیں لے سکتی۔



(۴) وراثت میں بیٹے اور بیٹی کے حصوں کے درمیان عدم مساوات۔

شریعت کے ان احکامات کو پیش کرکے یہ تصور عام کیا جاتا ہے کہ شریعت اسلامی مخالف عورت، اینٹی عورت یعنی عورتوں کے حقوق کے خلاف ہے اور عورتوں کو مجبور، محکوم اور کمزور رکھنا چاہتی ہے۔ اس مضمون کا جو موضوع ہے وہ مجھے اجازت نہیں دیتا کہ ان اعتراضات پر مکمل گفتگو کی جائے اور تفصیلی جواب دے کر یہ واضح کیا جائے کہ شریعت کے احکامات کس طرح عدل پر مبنی ہیں اور عورتوں کی ضروریات، حقوق اور احترام کا کتنا لحاظ وخیال شریعت نے رکھا ہے تاہم ان کا مختصر جائزہ ضروری ہے۔

## (الف) تعدد ازدواج:

اسلام تعدد ازدواج کی اجازت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی بیویوں کی تعداد کو چار کی حد تک محدود کرتا ہے۔ اسلام نے اس بارے میں کڑی شرطیں عائد کی ہیں اور سب کے ساتھ انصاف اور عدل کی اخلاقی پابندی بھی لگائی ہے۔ قرآن کریم تلقین کرتا ہے:

''اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں) سے یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت (کافی) ہے۔'' (سورۃ النساء۔۳)

یہ غلط تصور عمداً پیش کیا جارہا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان عام طور پر ایک سے زیادہ بیویاں رکھتے ہیں۔ یہ بات غلط اور بے بنیاد ہے اعداد وشمار اس کی تردید کرتے ہیں۔ مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت یک زوجگی پر کاربند ہے اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے والوں کا تناسب ہندوستان کے دوسرے مذہبی فرقوں کے مقابل مسلمانوں میں سب سے کم ہے مزید برآں مسلمان معاشی طور پر بہت ہی کمزور ہیں اور معاشی مجبوریاں بھی ایک سے زائد بیوی رکھنے کے عیش سے روکتی ہیں۔

شریعت اسلامی میں اس صورت حال کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے جب کہ بیوی کسی وجہ

اورسبب کی بنیاد پر ازدواجی ذمہ داری کو پورا کرنے کے قابل نہ ہو، یا شوہر اس کی ازدواجی صحبت سے تسکین نہ پاتا ہو، یا آبادی میں جنگ، فساد یا مسلح تصادم کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کے درمیان تناسب بگڑ گیا ہو۔ (جنگوں اور مسلح تصادم وفساد میں مرد زیادہ مارے جاتے ہیں اور عورتوں کا تناسب بڑھ جاتا ہے اور ایسی عورتوں کی تعداد کافی ہوجاتی ہے جن کے لئے شوہر کا ملنا بہت دشوار ہوجاتا ہے ) ان صورتوں کے علاوہ اور بھی کئی صورتیں ہوتی ہیں جن میں محدود تعدد ازدواج معاشرے کے لئے مفید اور سودمند ہوتا ہے۔ دوسری طرف یک زوجگی کے لزوم سے بے حیائی، فحاشی اور عورتوں سے ناجائز تعلقات میں اضافہ ہوتا ہے یک زوجگی کو قانون کے ذریعہ مسلط کرنے کے نتیجہ میں دوسری عورت سے ناجائز تعلق کو چھوٹ دینا تقریباً لازمی ہوجاتا ہے جس سے خاندانی زندگی بکھر جاتی ہے۔ مغرب اور مغربی معاشرہ اس کی بہترین مثال ہے جہاں تعدد ازدواج پر پابندی ہے اور جنسی انارکی اور نراج قابل قبول ہے۔ سوچئے تو سہی کس کا موقف بہتر ہے دوسری بیوی کا جس کو بیوی کا قانونی رتبہ حاصل ہے جس کے حقوق قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور جس کی اولاد کو قانون تسلیم کرنے پر مجبور ہے یا وہ داشتہ جو ’’اپنے آدمی‘‘ سے چپکی رہنے اور اس کی جیب پر بوجھ بننے کے لئے مجبور ہے کیوں کہ اس کے تعلق کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے اس کو کوئی قانونی حق حاصل نہیں اور نہ اس سے ہونے والی اولاد کو قانون تسلیم کرتا ہے۔ ایسی اخلاقی پابندیوں کے تحت محدود تعدد ازدواج کی اجازت دی گئی ہے جو شریعت انسانی معاشرے کو عطا کرتی ہے۔

## (ب) طلاق دینے کا یک طرفہ اختیار

شریعت نے شوہر کو طلاق دینے کا غیر محدود اور غیر مشروط اختیار دیا ہے ایسا حق بیوی کو حاصل نہیں ہے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ طلاق کے ساتھ ہی بعض مالی ذمہ داریاں طلاق دینے والے مرد پر عائد ہوتی ہیں جبکہ مطلقہ عورت پر کسی کا کوئی مالی حق نہیں بنتا۔ طلاق دینے والے مرد



کے لئے اگر مہر ادا نہ کیا گیا ہو تو مہر کا ادا کرنا، عدت کی میعاد کا نفقہ مطلقہ کو دینا، شیرخوار بچے ہوں تو ان کے خرچ کے علاوہ مطلقہ کو شیرخواری کی مدت تک اس کا معاوضہ دینا اور اس وقت تک جب تک کہ بچے ماں کی تحویل میں ہیں بچوں کے نفقوں کے علاوہ بچوں کی نگہداشت کی اجرت ماں کو دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ طلاق دینے والے مرد پر شریعت اسلامی کے اعتبار سے یہ تمام مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جس کے نتیجے میں وہ طلاق دینے سے پہلے ان تمام مالی ذمہ داریوں کو بھی ذہن میں رکھ کر فیصلہ کرتا ہے، مالی ذمہ داریوں کا احساس بھی جب مزاج میں آئے طلاق دینے سے روکتا ہے۔ مطلقہ عورت پر کوئی مالی ذمہ داری شریعت نے عائد نہیں کی ہے اگر کسی معاہدہ میں ایسی شرط ہو کہ معاہدہ ختم کرنے کے نتیجہ میں صرف ایک ہی فریق پر مالی ذمہ داری عائد ہوگی تو کیا دنیا کا کوئی قانون اس فریق پر جس پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں ہے یہ اختیار دے گا کہ وہ معاہدہ توڑ کر مالی نفع کمائے یا یہ اختیار اس فریق کو دیا جائے گا جس کو مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے بھی اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ طلاق کا اختیار کیوں مرد کے ہاتھ میں ہے اور کیوں عورت کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔

## (ج) طلاق حاصل کرنے میں عورت کی عدم اہلیت اور مجبوری:

اگر بالکلیہ غیر جانب داری کے ساتھ انصاف وعدل کے نقطہ نظر سے عورت کی فطرت کا جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ پیدا کرنے والے نے عورت کو دل اور دل کی بڑی دولت محبت، جذبات کی فراوانی اور احساسات کی تیز روانی سے نوازا ہے۔ یہ محبت اور جذباتی ساخت ایک ماں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اسی لئے پیدا کرنے والے خالق کائنات نے عورت کی فطرت میں غیر معمولی محبت، بے انتہا جذباتیت اور احساسات کی تیز روی رکھ دی ہے۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ شریعت کے احکامات موافق عورت ہیں (پرو ویمن ہیں اینٹی ویمن نہیں) تاہم عورت اگر یہ محسوس کرے کہ اس کا شوہر اس کے حقوق ادا نہیں کر رہا ہے

اور وہ زندگی سے اتنی عاجز آ چکی ہے کہ علیحدگی میں ہی نجات محسوس کرتی ہے تو شریعت نے اس کے آگے چار راہیں کھلی رکھی ہیں۔ طلاق تفویض، خلع، مبارات اور فسخ۔ اسلام کی تلقین یہ ہے کہ اگر بیوی تفریق یا علیحدگی کی خواہش کرے تو مرد اس کی تکمیل کر دے۔ ایسے مرد کے لئے جو اپنی بیوی کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے اور طلاق یا خلع کی اس کی خواہش پوری کرنے سے انکار کر دیتا ہے سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔

## (د) ترکہ کے حصے میں عدم مساوات:

اسلام کا قانون وراثت قرآن، حدیث، اور اجماع پر مبنی ہے اور بالخصوص بیٹے اور بیٹی کے حصوں کے درمیان عدم مساوات کی بات قرآن کے احکامات میں موجود ہیں۔ سورۃ النساء کی ۱۱ر تا ۱۴ر آیات میں اس کا بیان ہے کہ ایک ہی درجے اور رتبے کے ورثاء کے درمیان حصوں میں فرق و تفاوت اور عدم مساوات کی بنیاد جنس کا اختلاف نہیں بلکہ براہ راست اس کا تعلق ان ذمہ داریوں سے ہے جن کا بوجھ ان ورثاء پر ڈالا گیا ہے جو زیادہ حصہ پاتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ ’’جس کی جتنی ذمہ داری اس کا اتنا حق۔‘‘ میراث سے متعلق احکامات میں نفقات کے بارے میں شریعت کے قانون کے پس منظر میں غور کرنا چاہئے جس میں نزدیک اور دور کے رشتہ داروں کے نفقہ کی ذمہ داری زیادہ تر مرد پر عائد کی گئی ہے اور مرد کو بالخصوص خاتون رشتہ داروں کی ضرورتوں کا کفیل بنایا گیا ہے اور ان کے حق کو ترجیح دی گئی ہے جیسے باپ کے مقابل میں ماں کا حق، بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کا حق ترجیح رکھتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر عورت کو مرد کے مساوی حصہ دیا جاتا ہے تو یہ بات عدل اور انصاف کے خلاف ہوتی۔

مرد و عورت کے درمیان مساوات کا تصور اور ایک دوسرے کے خلاف حقوق کا دعویٰ مغربی ماڈرن ازم کی اہم خصوصیت ہے جس کے نتیجے میں مغرب میں خاندان بکھر رہا ہے اور ٹوٹ رہا ہے۔ مغرب نے عورت کو مرد کے خلاف، بیوی کو شوہر کے خلاف حریف اور مدمقابل بنا کر کھڑا



کر دیا ہے، جب کہ اسلام ان دونوں کو ایک دوسرے کا ساجھی و ساتھی اور ایک دوسرے کی تسکین کرنے والا قرار دیتا ہے یہ حریف اور مدمقابل نہیں بلکہ ایک دوسرے کے شریک کار ہیں۔ جن کی ذمہ داریاں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والی اور سہارا دینے والی ہیں۔ خاندانی زندگی کے میدان میں مخالف جنسوں کے درمیان مکمل اور مطلق مساوات قطعاً ناممکن ہے۔ ایک مملکت اور ایک حکومت چل نہیں سکتی اگر مساوی اختیار رکھنے والے دو افراد کو اس کا صدر بنا دیا جائے، ایسی صورت میں سماجی نظام کی بنیادی اکائی جس کو خاندان کہا جاتا ہے اس کی تشکیل کرنے والے دو افراد کے درمیان حقوق اور اختیارات کی مکمل اور مطلق مساوات قائم کر دی جائے تو دو صدور پر مشتمل یہ اکائی کیسے اور کس طرح خوش حال رہ سکتی ہے؟ اسلام اس معاملے میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرتا ہے اور مرد کو قوام قرار دیتا ہے جس پر خاندان کے استحکام، مالی ذمہ داری اور نگہداشت کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔

## ہندوستانی مسلم سماج:

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلم سماج میں سب کچھ ٹھیک اور درست ہے۔ ہم ایسے واقعات بھی سنتے ہیں کہ صرف مزے اور لطف کی خاطر دوسری عورت کو بیوی بنایا گیا اور پہلی کو اس طرح نظر انداز کر دیا گیا کہ اس کی بنیادی ضرورتوں کی بھی کوئی فکر نہیں۔ طلاق کے اختیار کے بے جا استعمال کے واقعات بھی ہوتے ہیں کہ کسی معمولی سی بات پر غصہ میں طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور عورت لاچاری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی ہے اس سے پیدا ہوئی اپنی اولاد کے تعلق سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کو فراموش کر دیا جاتا ہے ایسے واقعات بھی سامنے آتے ہیں کہ بیوی تنگ آ کر علیحدہ ہونا چاہتی ہے لیکن اس کو نہ طلاق دی جاتی ہے اور نہ اس کے حقوق ادا کئے جاتے ہیں لٹکا کر رکھا جاتا ہے۔

ترکہ کی تقسیم کے وقت بہنوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا بہنوں کی شادی کے موقع پر

باپ نے جو کچھ خرچ کیا تھا وہ ان کے حصے میں لگا دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی واقعات کو بنیاد بنا کر مسلم پرسنل لا کے خلاف شور شرابہ کیا جاتا ہے اور اعلان کیا جاتا ہے کہ مسلمان مرد، عورتوں پر ظلم کرتے ہیں اور اسلام عورتوں کے ساتھ ظلم کرتا ہے حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ مسلمان شریعت اور اسلامی احکامات کو پیٹھ پیچھے ڈال دیتے ہیں اور ان کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں شریعت کا احترام کیا جائے، تو مسلمانوں کو اپنے گھر کو بھی درست کرنا پڑے گا۔ یہ علماء کرام اور ملی کارکنوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کے احکامات سے عوام کو واقف کرائیں۔ عورتوں کے حقوق کے بارے میں شعور بیدار کیا جائے اور اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے اور شریعت کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا ذوق وشوق پیدا کیا جائے یہ کام بہت ضروری ہے۔

لیکن کبھی کوئی ایسا مطالبہ سننے میں نہیں آیا کہ جرائم کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے اس لئے قانون تعزیرات ہند کو ختم کر دیا جائے یا چوں کہ پولیس قانون، قاعدوں اور ضابطوں کو خود توڑ رہی ہے اس لئے ضابطہ فوجداری منسوخ کر دیا جائے۔ اگر مسلمانوں کے اندر شریعت کی خلاف ورزی کے واقعات کہیں کہیں ہو جاتے ہیں تو کیا یہ مطالبہ کرنا مناسب ہوگا کہ شریعت میں مداخلت کی جائے یا مسلم پرسنل لا کو منسوخ کر دیا جائے؟

## یونیفارم سول کوڈ سے کیا حاصل ہوگا؟

اوپر کی تمام گفتگو سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پرسنل لا کے معاملات میں مسلمانوں کا موقف کیا ہے، کسی اور قانون پر چلنے کے لئے مسلمانوں کو کہنا یا مجبور کرنا اگر ارتداد کی دعوت نہیں تو کم از کم مذہبی احکامات کی کھلی خلاف ورزی کی دعوت ضرور ہے، بے شک کوئی مسلمان ایسی دعوت کو قبول نہیں کر سکتا۔



اسی طرح وہ عوام جنہوں نے اپنی سماجی، مذہبی، رواجی، قانونی شناخت کو تسلیم کروانے کے لئے ہتھیار اٹھا لئے تھے اور مسلح کشمکش شروع کی تھی ان میں بھی اس صورت میں بے چینی پیدا ہو جائے گی، جب کہ آرٹیکل (۴۴) کے تحت یونیفارم سول کوڈ کو نافذ کرتے ہوئے ان کو دئے گئے تحفظات کو ختم کر دیا جائے۔

ہندو لاز میں بھی یکسانیت نہیں ہے، مختلف ہندو فرقوں، ذیلی فرقوں اور علاقائی رسوم و رواج کو برقرار رکھنے کی خاطر ریاستی اسمبلیوں نے ان میں کئی ترمیمات کی ہیں۔ ہندو سماج کی سماجی یکتائی و یکجائی کی قربان گاہ پر یکسانیت کی قربانی دی گئی۔ قبائیلیوں اور کئی تہذیبی گروہوں کو اپنے رواجی ضابطوں پر چلنے کی آزادی دی گئی۔ اگر ان سب پر یونیفارم سول کوڈ کی یکسانیت مسلط کر دی جائے تو یہ احساس عام ہوگا کہ ان کا حق اور ان کی آزادی چھین لی گئی۔

اس بات کو بھی ذہن نشین رکھئے کہ ایک کثیر مذہبی، کثیر نسلی اور کثیر تمدنی ملک میں جس کا رقبہ اور آبادی ذیلی براعظم کی نوعیت رکھتا ہو، یونیفارم سول کوڈ کا نفاذ نقصان دہ ہوگا۔

حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے اس بات کو محسوس کیا جانا چاہئے کہ اتحاد اور ہم آہنگی کی بنیاد دراصل اپنائیت کا احساس ہے اور یہ احساس اس اعتماد سے پیدا ہوتا ہے کہ میرے ملک میں میری کسی عزیز شئ، میرے مذہب، میرے تمدن، میری شناخت اور میری پہچان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ مختلف شناختوں کو تسلیم کرنے سے قومی یکتائی، ہم آہنگی اور اتحاد کو قوت ملے گی۔ کسی یونیفارم سول کوڈ کو مسلط کرنے کے نتیجے میں محرومی اور عدم تحفظ کے جذبات ابھریں گے جو ملک کے اتحاد اور یک جہتی کے لئے خطرہ بھی بن سکتے ہیں۔

اس لئے صحیح راستہ یہی ہے کہ آرٹیکل (۴۴) کو دستور سے نکال دیا جائے کیوں کہ یہ آرٹیکل یونیفارم سول کوڈ کے مسئلہ کو بار بار ابھرنے کا موقع دیتا ہے جس سے ملک کو کوئی مفاد حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس سے ملک کے مفادات مجروح ہوتے ہیں اور ان کو نقصان پہنچتا ہے۔